کیا اسلام کے حدود وتعزیرات دور قدیم کی یادگار نہیں ہیں؟ کیا انہیں آج کا ذہن قبول کرسکتا ہے؟

اسلام کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی تعلیمات سے متعلق اس طرح کے سوالات یا ان پر اعتراضات بالکل نئے نہیں ہیں۔ بعض سوالات صد ہا سال قبل سے کیے جاتے رہے ہیں اور مسلمان اہل علم کی طرف سے ان کا جواب بھی دیا جاتا رہا ہے۔ مولانا شبلی نے 'الکلام' میں اس طرح کے بعض مسائل کے سلسلے میں اسلام کے موقف کی وضاحت کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی شریعت پر اعتراضات کی تردید اور اس کی حکمت و معنویت کی وضاحت کا تسلسل جاری ہے۔ جس رخ سے بھی اس پر حملہ ہوا ہے، اس کا دفاع کیا جاتا رہا ہے۔ ان میں بعض کوششیں بڑی علمی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ لیکن ان کا عالمی سطح پر جو تعارف ہونا چاہیے، وہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس کی فکر ہونی چاہیے۔ اس کے باوجود مختلف وجوہ سے یہ کوششیں ایسی نہیں ہیں کہ علمی حلقے انھیں تسلیم کرنے لگیں اور اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ اسلام سے متعلق اعتراضات کا یہ مدلل جواب ہے۔ آج کے علم الکلام کو اسی مقام تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔

اسلام کے دفاع اور اس کی حقانیت کے اثبات کا کام انفرادی اور اجتماعی صلاحیتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ کام ان اصحاب علم وفضل کے بھی کرنے کا ہے جو جدید افکار ونظریات سے واقفیت اور اسلامی علوم میں بصیرت رکھتے ہیں۔ اس کے لیے اداروں کی بھی ضرورت ہے۔ دارالمصنفین ہمارا قدیم ادارہ ہے اور اسے علمی دنیا میں اعتبار حاصل ہے۔ وہ اس سلسلے میں پیش قدمی کرسکتا ہے۔ مولانا شبلی نے علم الکلام اور الکلام کو جس حد تک پہنچایا اسے اس سے آگے جانا چاہیے۔ بعض دوسرے ادارے بھی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنی کوششوں میں تیزی لانی ہوگی اور جدید دور کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔

☆☆☆

اعلانِ ملکیت، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔مقام اشاعت: نبی نگر، (جمال پور)، علی گڑھ

۲۔نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔قومیت: ہندوستانی

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۵۔ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،

پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۶۔ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی،

نبی نگر، (جمال پور)، علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۲—ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)

گلی نمبر ۲، فورٹ انکلیو، پٹواری کا نگلہ، علی گڑھ

۳۔ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)

شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

۴—پروفیسر صدیق حسن (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۵۔جناب محمد جعفر (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۶۔مولانا محمد فاروق خاں (رکن)

۱۳۵۳ — بازار چتلی قبر، دہلی — ۶

۷۔جناب ٹی، عارف علی (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵

۸۔جناب نصرت علی (رکن)

دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی — ۲۵

۹۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)

طارق منزل، بریا توہاؤسنگ کالونی، رانچی

۱۰۔انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)

10-3-297/303، ہارمنی اپارٹمنٹس، ہمایوں نگر، حیدرآباد — ۲۸

۱۱۔پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (رکن)

اسلام منزل، گلی نمبر ۸، اقرا کالونی، علی گڑھ

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر

سید جلال الدین عمری

تحقیق وتنقید

شیخ محمد عبدہ کی تجدیدی فکر کے بنیادی خدوخال

حافظ عقیل احمد قریشی

شیخ محمد عبدہ مصری (۱۸۴۹ ۔ ۱۹۰۵ئ) کی شخصیت متعدد خصوصیات کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک اچھے استاذ، ادیب، محقق، مؤرخ، صحافی، مصلح اور دانش ور تھے۔ اگر انہیں ہشت پہلو عالم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک معمولی دہقان، گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے افکار ونظریات سے ایک عالم کو منور کیا۔ ان کی ذہنی وفکری تربیت روشن خیال اساتذہ نے کی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر ان کے معاصرین کی طرح غلامانہ ذہنیت اور تقلیدی مزاج اپنا اثر نہ دکھا سکا۔ وہ ایک طرف مصر پر غیر ملکی قبضہ کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو دوسری طرف حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم رکھنا چاہتے تھے، تاکہ خود کو متوازن نقطۂ نظر کے حامل مفکر کے طور پر پیش کر سکیں۔ اس سے ان کی سیاسی حکمت عملی سامنے آتی ہے اور انتظامی معاملات میں ان کے حسن تدبیر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ پرانے نظریات کو نئے نظریات کا سامنا ہے اور انتہا پسندی کا زور ہے، چناں چہ انہوں نے ایسی میانہ روی اختیار کی کہ قرآن وسنت کی بنیادی تعلیمات پر کوئی زد نہ پڑے۔ انہوں نے مناسب سمجھا کہ ایک مرشد کی طرح کام کریں، تاکہ ان سے تربیت حاصل کرنے والے افراد ان کے کام کو آگے بڑھائیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو قلم اور دعوت کے ذریعہ رشد وہدایت کا محور بنایا۔ انہوں نے مسلم عوام میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ خود اسلامی تعلیمات کو ہوش مندی کے ساتھ سمجھ کر اُن پر عمل کریں۔

شیخ محمد عبدہ اسلامی تعلیمات اور مغربی علوم وفنون میں مغایرت کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک طرف اسلامی تعلیمات کو اہمیت دیتے تھے تو دوسری طرف مغربی علوم

وفنون سے چشم پوشی کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کے اواخر میں فرانسیسی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ مغرب کی مادی ترقی کی اثر انگیزی کے قائل تھے، لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ مغرب کا سیکولرزم بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ انہوں نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ اہلِ مصر کا سیکولرزم کی راہ پر چلنا ان کے اندر پھوٹ پیدا کررہا ہے، اس لیے انہوں نے انہیں اس کے خلاف بیدار کرنا اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ان کی خواہش تھی کہ بحیثیت مسلمان انھیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہو اور وہ جان لیں کہ ان کا دین اُن کی پس ماندگی کا باعث نہیں، بلکہ وہ تو ان کی سماجی ترقی چاہتا ہے اور اس کے ذریعہ ان کے تمام دنیاوی مسائل ومشکلات حل ہو سکتے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ کی دینی تجدیدی فکر کے سلسلے میں چند بنیادی نکات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

دین میں عقل کا مقام

شیخ محمد عبدہ کی فکر میں عقل کو اہم مقام حاصل ہے۔ انھوں نے دین کی تفہیم کے لیے عقل کو تقلید کی قید سے آزاد کرنے کو ضروری قرار دیا۔ امام موصوف سے قبل دین میں عقل کے استعمال کو الحاد وزندقہ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس کا استعمال صرف دنیوی معاملات تک محدود تھا۔ شیخ عبدہ نے دنیاوی اور دینی معاملات میں عقل کے تفاوت کو ختم کیا۔ ان کے نزدیک اسلام ایک عقلی مذہب ہے۔ انہوں نے اس حقیقت پر بہت سے دلائل دیے ہیں۔ ا۔ جن میں سے تین نقل کیے جاتے ہیں:

ا۔ غزوۂ خندق کے بعد حضور ﷺ کو بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ کے احاطہ میں۔ صحابہؓ روانہ ہوئے تو ان میں سے بعض نے وقت کی تنگی کی وجہ سے راستے میں نماز عصر پڑھ لی، کیوں کہ عقل کے مطابق حکم کا مقصود جلدی پہنچنا ہے، نہ کہ نماز کو قضا کر دینا۔ جب کہ بعض نے راستے میں نماز نہیں پڑھی، بلکہ بنو قریظہ کے یہاں پہنچ کر

پڑھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپؐ نے نماز پڑھنے والوں کی سرزنش نہیں کی، بلکہ ان کے استعمال عقل کو درست قرار دیا۔ ۲؎

۲۔ ایک عورت نے حضورؐ سے پوچھا کہ میری والدہ نے حج کرنے کی منت مانی تھی، لیکن ان کا انتقال ہوگیا ہے۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: تیرا کیا خیال ہے، اگر اس پر قرض ہوتا تو کیا اس کو ادا کرتی؟ اس عورت نے کہا: بے شک، میں ادا کر دیتی۔ تب آپؐ نے فرمایا: حج بھی قرض ہے، لہٰذا اس کو بھی ادا کر۔ ۳؎ اس حدیث میں بھی استعمالِ عقل کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کو دینی مسئلہ میں معتبر قرار دیا گیا ہے۔ ۳؎

۳۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو دوران سفر غسل کی حاجت تھی، لیکن سخت سردی کی وجہ سے انہوں نے غسل نہیں کیا، بلکہ تیمم کرکے نماز پڑھا دی۔ اس پر بعض صحابہ نے اعتراض کیا۔ جب یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو حضرت سعدؓ نے آپؐ کے سامنے اپنا عذر بیان کیا۔ اس پر آپؐ نے ان کی کوئی گرفت نہیں کی۔ ۴؎

ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے عقل کا میزان عدل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ قرآن مجید لوگوں کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے بارے میں شیخ عبدہ فرماتے ہیں:

> ''قرآن مجید ایسا معجزہ ہے جس کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے اور غور کرنے والا اس کو پہچان لے گا۔ قرآن مجید میں غور وفکر کو روا رکھا گیا ہے اور اس کے مضامین کو پھیلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں عقل کا وافر حصہ ہے''۔ ۵؎

یہی وہ موقف ہے جو اسلام کو باقی ادیان سے ممتاز کرتا ہے اور اس کی تہذیب وثقافت کو دوسری تہذیبوں سے جدا کر دیتا ہے۔ دوسرے ادیان میں دین و عقل میں ایسی منافات ہے جسے دور نہیں کیا جاسکتا، جب کہ اسلام میں عقل و دین کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام عقل کو کائنات اور اصول دین میں غور وفکر کی

دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران جابجا غور وفکر کی دعوت اور اس کے اسرار ورموز کو تلاش کرنے کا حکم ملتا ہے۔ چند آیات درج ذیل ہیں۔

"قُلِ انظُرُواْ مَاذَا فِيْ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْض" (سورۂ یونس:۱۰۱)

'ان سے کہو: زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو'۔

أَفَلَمْ يَسِيْرُوا فِيْ الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا (الحج:۴۶)

'کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے ہوتے'۔

"أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ" (الغاشیۃ:۱۷)

'کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے'۔۔۔؟

" قُلْ سِيْرُوا فِيْ الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْق" ۞
(العنکبوت:۲۰)

'ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے'۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ قرآن مجید میں کسی چیز کا کثرت سے ذکر اس کے اہم اور باعظمت ہونے کی دلیل ہے۔ تخلیقات میں غور وفکر پر آمادہ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان بہ قدر وسعت کائنات کے اسرار ورموز سے واقف ہو کر ایسے علوم وضع کر سکے جن سے انسانی معاشرہ ترقی کی سیڑھیاں چڑھ سکے۔

تقلید اور روشن خیالی کے درمیان

محمد عبدہ کے بہ قول مسلمانوں میں دو طرح کے گروہ پائے جاتے ہیں: ایک گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اپنے اسلاف کے فرمودات اور روایات کی اندھی تقلید کرتا ہے اور جدید افکار ونظریات کو الحاد وزندقہ قرار دیتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ مذہب کو فرسودہ اور جدید تقاضوں سے بے بہرہ سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ اپنے آپ کو روشن خیال کہتا ہے اور مغرب کی اندھی تقلید میں دین کی ترقی اور اسلام کی اشاعت کو معاشرتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ امام موصوف نے ان دونوں گروہوں کے درمیان کی راہ اختیار کی۔ وہ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ دونوں کی یکجائی

کے قائل تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے جامعہ ازہر کو چنا، لیکن جب وہ اس میں کام یاب نہ ہو سکے تو اپنی نئی حکمت عملی کے تحت دارالعلوم کو منتخب کیا۔

انہوں نے اس اصلاح کی ابتدا دینی مدارس سے کرنی چاہی، کیوں کہ دین انہی اداروں کی مدد سے معاشرے میں اپنا اثر ونفوذ قائم کرتا ہے۔ ان کے خیال میں ان اداروں کی اصلاح سے پورے معاشرے کی اصلاح کی داغ بیل پڑ جائے گی۔

تفسیر قرآن کا صحیح منہج

دین کو سمجھنے کا بنیادی ذریعہ قرآن مجید ہے۔ اس لیے شیخ عبدہ نے تفسیر قرآن کے بارے میں بڑا اہم موقف اختیار کیا۔ قرآن کا حقیقی اعجاز یہ ہے کہ وہ مرورِ ایام، جگہ کے اختلاف اور لوگوں کی جنس کے تعدّد کے باوجود ان کو اچھے معاشرے کی تشکیل، درست راستے اور خلق عظیم کی رہ نمائی کرتا ہے۔ قرآن کسی فن، تاریخ، ادب یا کسی اور علم کی کتاب نہیں ہے، یہ کتابِ ہدایت ونصیحت ہے۔ اس لیے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے یہ مقصد پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ قرآن کو کتاب ہدایت کی حیثیت سے سمجھا جائے، تاکہ وہ لوگوں کی رہ نمائی ان امور کی طرف کرے جن میں دنیا وآخرت میں ان کی کام یابی پوشیدہ ہے۔

امام موصوف کے نزدیک تفسیر قرآن میں عقل نہایت بلند مرتبہ کی حامل ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی جدید تقاضوں سے معمور تفسیر کے لیے، جو دور جدید کے تقاضوں کے مطابق بھی ہو، ضروری ہے کہ سابقہ مفسرین کی تقلید کو ترک کر کے قرآن کے حقیقی مفہوم سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے لیے ان کے خیال میں ان چیزوں کی ضرورت ہے: (۱) لغت کا علم (۲) اسباب نزول سے واقفیت (۳) سیرتِ نبوی ؐ کا علم (۴) تاریخ انسانی اور خصوصاً ان قبائل کی تاریخ کا علم جن کے بارے میں قرآن مجید نے گفتگو کی ہے۔

شیخ موصوف کا خیال تھا کہ سابقہ مفسرین کی تفاسیر ان کے زمانے کے تقاضوں کے مطابق تھیں، لیکن اب تقاضے اور ضروریات بدل گئی ہیں اور علم میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ تفسیر قرآن کو

ازسرنو تحریر کیا جائے۔ قرآن مجید ہدایت اور رہنمائی کے لیے آیا ہے۔ اس لیے اس کو اسی حد تک محدود رکھنا ضروری ہے، اس سے دوسرے علوم ونظریات پر استدلال کرنا درست نہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور تجربات ومشاہدات سے نوازا ہے۔

معاشی افکار

امام موصوف کے معاشی افکار اشتراکیت سے قریب ہیں، لیکن یہ کمیونسٹ اشتراکیت نہیں ہے، بلکہ وہ اشتراکیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اموال کی نسبت فرد واحد کی طرف کرنے کی بہ جائے پوری امت کی طرف کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے افراد کسی مال کو اس کے دنیوی مالک کی رضا کے بغیر چوری، ڈاکہ اور دھوکہ دہی وغیرہ کے ذریعے ہڑپ کرلیں۔ جس طرح ان کے لیے کسی فرد کے اموال میں تصرف کرنا اس کی رضا کے بغیر ناجائز ہے، اسی طرح صاحب مال کے مال میں زکوٰۃ وصدقۂ فطر وغیرہ کے علاوہ بھی دوسروں کے حقوق واجب ہیں۔

امام موصوف معاشرے کو دو طبقات میں تقسیم کرتے ہیں: فقراء اور مال دار۔ مال دار چوں کہ بنیادی طور پر تمام مصالح کے مالک ہوتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس لیے امن وسکون، ملکی حفاظت اور تمام معاشرتی مصالح کی ادائیگی کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوتی ہے۔ اور ان مصالح کے اخراجات کا مطالبہ بھی انہی سے کیا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ طبقات ہمیشہ باقی رہیں، بلکہ اس استحصالی نظام کا خاتمہ ضروری ہے جو امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا رہا ہے۔ معاشرے کے تمام افراد کو ان کی صلاحیت کے مطابق آگے بڑھنے کے مواقع میسر ہونے چاہئیں۔

ذیل میں اسلام کی اس اجتماعی اور اقتصادی فکر کو پیش کیا جاتا ہے، جس کو بنیاد بنا کر امام موصوف نے اپنے زمانے کی ضروریات اور مشکلات کا حل نکالا ہے:

۱۔ ابتداء میں اسلام قبول کرنے والوں کی اکثریت غلاموں اور فقراء پر

مشتمل تھی۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر وہ آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو ایک ایسی تحریک کے طور پر پہنچان لیا تھا جو انہیں ان کے غصب کردہ حقوق واپس دلا سکتا ہے۔ اس لیے جب مال دار اور سر بر آوردہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ وہ ایسی صورت میں ایمان لائیں گے جب غریب پیروکاروں کو دور کر دیا جائے تو اللہ کے رسول ﷺ نے یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قرآن مجید نے حضرت نوح ؑ اور ان کی قوم کا قصہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔قوم نوح ؑ نے ان سے کہا:

''أَنُؤْمِنُ لَکَ وَ اتَّبَعَکَ الْأَرْذَلُونَ'' ۝ (الشعراء:۱۱۱)

''کیا ہم تجھے مان لیں، حالاں کہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے''۔

اس کے باوجود حضرت نوح ؑ نے انہی لوگوں کی مستقل صحبت اختیار کی جو مال و دولت اور سماجی عزت کے اعتبار سے بہت کم تھے، لیکن انجام کار اور نصرت الٰہی انہی کا مقدر بنی۔

۲۔ مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد مسلمانوں نے ایک اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی۔ وہاں حضور ﷺ نے لٹے پٹے مہاجرین اور انصار کے درمیان دو باتوں پر رشتۂ مواخات قائم کر دیا: ایک یہ کہ وہ حق کے معاملے میں ایک دوسرے کی رہ نمائی کریں گے ، دوسرے یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رزق اور معاش میں شریک کریں گے۔ مواخات صرف ان دو باتوں تک محدود نہ رہی، بلکہ موت کے بعد وراثت میں جاری رہی یہاں تک کہ سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ نازل ہوئی وَأُوْلُواْ الأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ تو توارث منسوخ ہو گیا، لیکن رزق و معاش میں مشارکت کا سلسلہ جاری رہا۔ فقراء اغنیاء کے اموال میں اتنا حق رکھتے ہیں جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ یہی بات امام موصوف نے آیت يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النسائ:۲۹) کی تفسیر میں فرمائی ہے۔

زائد از ضرورت مال جمع کرنے کی ممانعت کے موقف کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حضرت ابو سعید خدری ؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ ہم

نبی اکرمؐ کے ساتھ سفر میں تھے کہ ایک آدمی سواری پر آیا۔ وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس کوئی زائد سواری ہو وہ اسے اس شخص کو دے دے، جس کے پاس سواری نہ ہو۔ جس کے پاس زائد از ضرورت زادِ راہ ہو وہ اسے اس شخص کو دے جس کے پاس نہ ہو۔۔۔۔۔۔ راوی کہتے ہیں کہ آپؐ نے مال کی تمام اقسام کو ذکر کیا، یہاں تک کہ ہم نے یہ خیال کرلیا کہ ہم میں سے کسی کا بھی زائد مال میں حق نہیں ہے۔ ۶؎

اسلام کی انہی تعلیمات کی روشنی میں شیخ محمد عبدہ نے اپنے معاشی اور معاشرتی تجدیدی افکار کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے اپنے زمانے کی ضروریات اور احتیاجات کو سامنے رکھ کر ان آراء کا اظہار کیا، جو درحقیقت قرآن وسنت سے مستفاد تھیں۔ ان کے معاشی افکار یورپی اور مغربی افکار وشخصیات سے مستفاد نہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں ان کے تدبر وتفکر کا نتیجہ ہیں۔

سیاسی نقطۂ نظر

سیاسی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ محمد عبدہ کہتے ہیں کہ سیاست درحقیقت اسلام میں ریاست وحکومت سے عبارت ہے۔ اس لیے یہ سوال اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں حکومتیں کس طرح کی ہونی چاہئیں؟ اس کا جواب امام موصوف یہ دیتے ہیں کہ اسلام کسی صورت میں بھی دینی اجارہ داری کا قائل نہیں اور نہ اس کی تائید کرتا ہے، بلکہ اس کا مقصد دینی اجارہ داری کا خاتمہ ہے۔ اسلام ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھتا ہے جس میں معاشرے کی فلاح وبہبود پیش نظر رہے۔ دینی اجارہ داری کا مطلب یہ ہے کہ آپ دین کے نام پر حکومت نہیں کر سکتے کہ آپ کے احکام کو دینی احکام کی سند عطا کی جائے۔ کیوں کہ اسلام نے یہ اختیار تو اپنے نبی کو بھی نہیں دیا، چہ جائے کہ کسی عام حاکم یا مفتی و قاضی کو ہو۔ یہ لوگ صرف رہ نمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں۔

امام موصوف اس سے دو قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اسلام جن مقاصد

کے لیے آیا ہے ان میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ دینی اجارہ داری کا خاتمہ کیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ فرماتے ہیں۔

''اسلام کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ دینی اجارہ داری کو تبدیل کر کے اس پر دین کی بنیاد رکھی جائے۔ اسلام نے اس تسلط کی بنیاد کو گرا دیا ہے اور اس کے نشانات مٹ دیے ہیں۔ یہاں تک کہ جمہور کے ہاں اس کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اسلام اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے کے عقیدہ اور ایمان پر اجارہ داری کا داعی نہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے مبلغ و ناصح ہونے کے باوجود ان کو نگراں و محافظ نہیں بنایا تو کسی مسلمان کے لیے بھی یہ جائز نہیں، چاہے اس کا مقام اسلام میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو'' ۷۔

امام موصوف کے نزدیک اسلام کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر حقّ تسلط نہیں دیتا، سوائے اس کے کہ وہ اس کو نصیحت کر سکتا ہے اور درست راستے کی طرف اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کو نصیحت کریں اور ایک ایسی امت کی تعمیر کریں جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے۔ وہ اس امت کے نگراں ہیں، اس حد تک کہ جب وہ سیدھے راستے سے ہٹ جائے تو اس کو دعوت، نصیحت، انذار و تبشیر کے ذریعے راہ راست پر لائیں۔ امت مسلمہ کے کسی فرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے فرد کے عیب ڈھونڈے، یا اس کے عقیدہ کی جاسوسی کرے۔ اسی طرح کسی فرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے عقیدہ یا اعمال کے اصول، اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی اور سے حاصل کرے۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کا حکم اس کی کتاب قرآن مجید سے اور رسول اللہ ﷺ کا حکم اس کی احادیث سے سمجھے۔ لیکن اس سے پہلے اس پر واجب ہے کہ وہ ان وسائل کو حاصل کرے جو اسے سمجھنے کے قابل بنا سکیں۔ اس کے بارے میں شیخ موصوف فرماتے ہیں:

''کسی بھی قوم کے ہاں کسی بھی شکل میں جس کو دینی اجارہ داری

کہا جاتا ہے وہ اسلام میں نہیں ہے۔ مسلمان اپنی تاریخ میں کسی ایسی اجارہ داری سے واقف نہیں جو عیسائی علماء کو حاصل تھی، جس کے ذریعے وہ بادشاہوں کو معزول کر دیتے تھے، امراء سے مال چھین لیتے تھے، ان کے مخالفین کو ان پر مسلط کر دیتے تھے اور اپنے ان امور کو خدائی آئین قرار دیتی تھے۔'' ۸؎

شیخ موصوف کی رائے یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظامِ حکومت ہونا چاہیے، اور حاکم ہر طرح سے معاشرتی ہو، اس کا چناؤ اور معزولی دونوں معاملے لوگوں کی رائے کے تابع ہوں، اس میں کوئی خدائی حق نہ، ہو ورنہ حاکم اس کو جزو ایمان بنا کر اپنے مفادات سمیٹتا رہے گا۔ شیخ موصوف کی رائے کے مطابق حکومت شریعت کے منافی نہیں۔ کیوں کہ اسلام ایک دین بھی ہے اور شریعت بھی۔ اس میں کچھ حدود وضع کیے گئے ہیں اور کچھ حقوق مقرر کیے گئے ہیں۔ اب ضروری نہیں کہ اسلامی احکام ظاہرہ کا معتقد ان پر عمل بھی کرے، کیوں کہ نفسانی خواہشات بسا اوقات غالب ہو جاتی ہیں، حق سے پہلو تہی کی جاتی ہے اور سرکشی بڑھ جاتی ہے۔ اس صورت میں تشریع احکام کی حکمت کی تکمیل کی ایک ہی صورت ہے کہ حدود قائم کرنے، حق کے ساتھ قاضی کے حکم کو نافذ کرنے اور اجتماعی نظام کو بچانے کی طاقت ہو اور یہ طاقت بہت سے افراد کے سپرد نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ قوت کسی ایک شخص کو سپرد کی جائے، چاہے وہ بادشاہ ہو یا خلیفہ۔ اس کا انتخاب امت کی ذمہ داری ہے، وہی اس پر نگراں بھی ہے۔ جب اس کو معزول کرنے میں مصلحت ہو تو اس کو معزول کر دے۔ اس لیے حاکم کو ہر صورت میں معاشرتی ہونا چاہیے۔ ۹؎

نظریۂ تعلیم

کسی بھی معاشرے کو درست سمت میں چلانے کے لیے تعلیم و تربیت نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس تربیت اور اصلاح کو دین کے رنگ میں دین کی طرف منسوب کر کے پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ شیخ موصوف کے نزدیک مشرق اور

اہل مشرق کی اصلاح دین کی طرف نسبت کیے بغیر ممکن نہیں، کیوں کہ یہ لوگ دین سے حد درجہ محبت رکھتے ہیں، بلکہ اس کے شیدائی ہیں۔ البتہ وہ تعلیم میں تفاوت کے قائل تھے، کیوں کہ تمام افراد معاشرہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے ان کی تعلیم میں حسبِ ضرورت تفاوت ضروری ہے، تا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کماحقہ اس سے استفادہ کرسکیں۔ ۱۰؎

تعلیم وتربیت کے حوالے سے شیخ محمد عبدہ نے جو فکر پیش کی ہے وہ واقعی مثالی ہے۔ ان کے نزدیک تربیت وہ جادوئی چھڑی ہے جو ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔ منفی کو مثبت اور ناقص کو کامل بنا دیتی اور مقید کو آزاد کر دیتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"انسان تربیت کے بغیر حقیقی انسان نہیں بن سکتا۔ وہ جب تربیت پاتا ہے تو اپنے آپ سے محبت کرتا ہے، تا کہ دوسرے اس سے محبت کریں۔ اپنے غیر سے محبت کرتا ہے، تا کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرسکے"۔ ۱۱؎

ان کے نزدیک انسان اگر تربیت سے محروم ہو تو ہر شے سے محروم ہوتا ہے۔ تعلیم وتربیت کے بغیر وہ عدل، تونگری اور کمال کے زیور سے آراستہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ جاہل کا عدل ظلم کے مترادف ہے، اگرچہ اس سے سچائی کی نیت سے صادر ہوا اور جاہل کی تونگری بھی فقر ہے، کیوں کہ اس کو اگر اتفاقاً دولت مل گئی تو کبھی نہ کبھی اس سے چھن جائے گی اور وہ محتاج ہوجائے گا۔ اور جاہل کا کمال بھی نقص ہے، کیوں کہ یہ تو ویران دیوار پر لیپا پوتی ہے، جو کچھ عرصے کے بعد اس سے جھڑ جائے گی اور دیوار گر جائے گی۔

شیخ موصوف نے تعلیم وتربیت کے اخراجات کو مال داروں پر لازم کیا ہے، کیوں کہ وہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار اور حقیقی مصالح کے مالک ہوتے ہیں۔ شیخ کے نزدیک اس میں مال داروں کا کردار حکومتی کردار سے بھی اہم اور بڑا ہے۔

خاندان کی اصلاح

اصلاحِ امت اصلاحِ خاندان پر موقوف ہے۔ کیوں کہ خاندان ہی امت کو وجود میں لاتے ہیں۔ جو قوم خاندانی نظام کو درست نہیں کرسکتی اس میں امت بننے کی

صلاحیت بھی نہیں ہوتی ۔ افراد خاندان مرد وعورت پر مشتمل ہیں جو اپنے حقوق ،اعمال اورشعور وعقل میں مساوی ہیں ۔ امام موصوفؒ کے فکری آثار میں خاندان کی اصلاح کا اہتمام خاص طور پر نظر آتا ہے، کیوں کہ خاندان کی درست خطوط پر استواری ہی معاشرے اورامت کی اصلاح کی ضامن بن سکتی ہے ۔ امام موصوف فرماتے ہیں :

> ”بے شک امت خاندانوں سے مرکب ہے ۔ امت کی اصلاح خاندان کی اصلاح پر موقوف ہے۔جس کا کوئی خاندان نہیں اس کی کوئی امت بھی نہیں ۔ کیوں کہ ایک دوسرے پر رحم کرنا اور ایک دوسرے سے تعاون کرنا فطرتاً اولاد اور والدین کے درمیان پایا جاتا ہے، پھر ان سے تمام رشتہ داروں میں منتقل ہوتا ہے ۔جس آدمی کی فطرت بگڑ جائے اس میں گھر والوں کے لیے خیر باقی نہیں رہتا ہے اور جس آدمی میں لوگوں کے لیے بھلائی نہیں وہ تکوین امت میں حصہ نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ جس آدمی سے نسبی رشتہ منتفع نہیں ہوسکتا دوسرے رشتے اس سے کیا نفع مند ہوں گے ۔جو چیز اس کے خاندان کوخوش کرے گی وہ امت کو خوش کرے گی اور جو چیز اس کے خاندان کوتکلیف دے گی وہ امت کو تکلیف دے گی ۔ اس لیے مناسب ہے کہ وہ امت کی منفعت کو اپنے خاندان کی منفعت سمجھے اور امت کے نقصان کو اپنے خاندان کا نقصان سمجھے ۔یہی چیز امت کے ہر شخص پر واجب ہے“ ۔ ۱۲؎

شیخ موصوفؒ کی رائے کے مطابق خاندانی رشتہ ہی معاشرے میں محتاجوں اور فقراء کی مدد کا پہلا مرحلہ ہے ۔ نچلی سطح پر خاندانی اصلاح اونچی سطح پر اصلاح میں قوت کا باعث بنتی ہے ۔ جب ایک خاندان اپنی نسبی قرابت داری کی وجہ سے دوسرے خاندانوں سے تعاون کرے گا تو اس طرح آپس میں تعاون کرنے والے خاندانوں کے درمیان ایک بڑی قوت پیدا ہوجائے گی ۔ اس قوت کی وجہ سے ان محتاجوں کے ساتھ حسن سلوک ممکن ہوجائے گا جن کا کوئی خاندان نہیں ہے ۔ پھر حسن سلوک اورآپس میں تعاون کا معاملہ صرف نسب اور رشتہ داری